اردو

جماعت دسویں حصہ اول

تعریف غزل

غزل کے معنی ہیں عورتوں کے متعلق باتیں کرنا۔ اصطلاحِ شعر میں غزل ان اشعار کو کہتے ہیں جو ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ میں ہوں۔ غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے بعد والے شعر کے پہلے مصرعہ میں قافیہ کی قید نہیں رہتی۔ اگر اس میں بھی پہلے مصرع میں قافیہ کی پابندی کی جائے تو اسے حسنِ مطلع یا زیب مطلع کہتے ہیں۔ آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ اس کو مقطع کہتے ہیں۔

غزل کے ہر شعر کا مطلب جدا گانہ ہوتا ہے۔ مگر ایسی غزلیں بھی ہیں جو ایک ہی مضمون کو مسلسل پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہیں اور ایسی غزل کو غزلِ مسلسل کہتے ہیں۔ کبھی کبھی غزل میں صرف دو تین ہی اشعار مسلسل ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار کو قطعہ کہتے ہیں۔

غزل کا سب سے اچھا شعر بیت الغزل یا شاہ بیت کہلاتا ہے۔ جس غزل میں ردیف نہ ہوں اور صرف قافیے ہوں اس غزل کو غیر مردف کہتے ہیں۔ وہ بحر اور ردیف و قافیہ جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے اسے غزل کی زمین کہتے ہیں۔

اردو میں غزل فارسی سے آئی۔ اس لئے اس کے مضامین میں بھی زیادہ تر فارسی کی ہی تقلید کی گئی ہے۔ قدیم شعراء غزل کو صرف عشقیہ مضامین تک محدود رکھتے تھے۔ مگر بعد کے اساتذہ نے اس میں تصوف، فلسفہ، وعظ اور اخلاقی مضامین کے علاوہ معاشرتی، سماجی غرض انسانی زندگی کے متعلق سارے معاملات اس میں داخل کر دئے۔

غزل کی زبان شیرین اور شستہ ہونا ضروری ہے۔ مشکل الفاظ اور تراکیب کا استعمال غزل کے لئے جائز نہیں ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ اکیس اشعار کی غزلیں بھی لکھی گئی ہیں۔ غزل اردو شاعری کی سب سے عام پسند اور محبوب صنفِ سخن ہے۔

میر تقی میرؔ کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

نام میر تقی میرؔ تھا۔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی تھا جو علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ چھوٹی عمر میں ہی میرؔ کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ میر تقی میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امان اللہ سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین آرزو سے تربیت حاصل کی۔ سراج الدین خان آرزوؔ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کو دیکھ کر میرؔ کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ دلّی کی تباہی کے بعد میر تقی میرؔ دلّی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ آپ کی عمر کا آخری حصہ پریشانیوں میں گزرا اور گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ میر تقی میرؔ کو اردو کا بہترین غزل گو تصور کیا جاتا ہے۔ میرؔ کے بعد آنے والے ہر ایک چھوٹے بڑے شاعر نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کی کلیات چھ دیوان پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی مثنویاں اور مرثیے بھی لکھے ہیں

غزلیاتِ میر تقی میرؔ

غزل ۱:

ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تمام تھام لیا

غزل کے اس مطلعے میں شاعر میر تقی میرؔ کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب تمہارا ذکر جب میرے سامنے کیا گیا تو میرے دل کی بے قراری بڑھ گئی اور اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس دل کو جو تمہارے ظلم و ستم سہتا آیا ہے۔ میں نے تھام کے رکھا یعنی بڑی مشکل سے اُس پر قابو پالیتا ہوں۔

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھو
نہ سیدھی طرح سے ان نے میرا سلام لیا

شاعر کہتا ہے کہ میرا بے وفا محبوب مجھ سے اچھے طریقے سے کبھی بھی پیش نہیں آیا۔ وہ مجھ سے ٹھیک طریقے سے کبھی بھی نہیں ملا۔ جب بھی میں نے ان کو سلام کیا وہ سلام ٹھیک طریقے سے نہیں لیا۔ سلام کا جواب دینا تو دور کی بات ہے۔

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

شاعر کہتا ہے کہ میں نے محبت میں وہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ میں ساری زندگی محبت نبھاؤں گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مجھے ساری زندگی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ہر وقت محبت نبھانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر چہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میؔر
یہ میرے شعر نے روئے زمین تمام کیا

شاعر میر تقی میؔر اس شاعرانہ تعلیٰ میں اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہتے ہے کہ اے میؔر اگر تو تنہائی کے ایک کونے میں تمام شاعروں سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا لیکن میں نہیں جانتا ہوں کہ تمہارے شعر کس طرح ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ان کا چرچہ کیسے روئے زمین پر ہوا۔

غزل نمبر۲:

ہنگامہ گرم کن جو دل نو صبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

غزل کے اس مطلع میں شاعر میری تقی میؔر کہتے ہیں کہ میرا دل فتنہ فساد کو بڑھانے کیلئے بے تاب تھا۔میرا دل اس قدر اضطراب میں ڈھوبا ہوا تھا کہ اس کے نالوں یعنی فریاد میں قیامت کے شور جیسی شدت پیدا ہوگئی تھی۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تئین
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

میر تقی میؔر کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنے آپ کو پہچانا یعنی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کس لئے آیا ہوں تو میں نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اور میں اس حقیقت سے واقف ہوا کہ جب ایک انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے اسے خود بخود خدا کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔میؔر کہتے ہیں کہ آج مجھے احساس ہوا کہ میں خود سے کتنا دور تھا بقول شبیب رضوؔی:

اس نے کتنی لطیف بات کہی
خود شناسی خدا شناسی ہے
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہِ طور تھا

شاعر میر تقی میرؔ کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ نے دیدار الٰہی کی استدعا کی تو نور الٰہی کی تجلی سے کوہ طور ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ یک دم بے ہوش ہو گئے۔ شاعر کے مطابق پیغمبر موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ یعنی اپنے محبوب کے وصال کی تڑپ اس قدر نہ تھی اس لئے وہؑ بے ہوش ہو گئے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پہ کو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

شاعر میر تقی میرؔ اس شعر میں مختصر کہانی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کل میرا پاؤں ایک انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا جونہی مجھے نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ کھوپڑی بوسیدہ ہو چکی تھی یعنی اس کی ہڈیاں خستہ ہو چکی تھی۔

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

شاعر کہتے ہیں کہ اس کھوپڑی سے ایک آواز آئی کہ اے بے خبر راہ گیر ذرا دیکھ کر چلو میں بھی کبھی کسی مغرور انسان کا سر تھا۔ شاعر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنے وجود پر کبھی گھمنڈ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک نہ ایک دن اسے مٹی میں مل جانا ہی ہے۔

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھتے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

میرؔ اس شاعرانہ تعلّی میں کہتے ہیں کہ اے میرؔ! تمہیں خدا نے اس قدر خوبصورت بنایا ہے کہ خلد کی خوریں بھی تیری خوبصورتی پر رشک کریں۔ لیکن لوگ اس بات کو اگر نہیں سمجھتے ہیں تو ان کی نا سمجھی ہیں۔

کتابی سوالات

جواب(۱) چونکہ شاعر میرؔ کا قلب محبوب کے ہجر میں اضطراب میں ڈھوب گیا ہے۔ جب شاعر کے سامنے محبوب کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس اضطراب قلب میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شاعر اپنے دل ستم زدہ کو تھام لیتا ہے۔

جواب(۲) صنعت تعلّی اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ درسی کتاب میں میر تقی میرؔ کی شامل شدہ غزلوں میں جو اشعار شاعرانہ تعلّی کے طور پر درج کئے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمین تمام کیا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

جواب(۳) کھوپڑی نے کہا!

اے بے خبر راہ گیر ذرا دیکھ کر چلو میں بھی کسی دن کسی مغرور انسان کا سر تھا۔ مقصد یہ کہ انسان کو اپنے وجود پر کبھی گھمنڈ نہیں ہونا چاہئے ۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن اسے مٹی میں مل جانا ہی ہے۔

جواب(۴) تلمیح سے مراد کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شاعر میر تقی میؔر نے اپنی غزل میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نور کی شدت برداشت کے باہر ہے۔ مگر موسیٰؑ بضد رہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے نور کی تجلی کی جھلک کوہ طور پر دکھائی تو موسیٰؑ یک دم بے ہوش ہو گئے اور کوہِ طور ریزہ ریزہ ہو گیا۔

داستان

عام طور پر داستان پرانے زمانے کی لمبی اور رومانی کہانی کو کہتے ہیں۔ داستان بہت ہی لطیف انداز میں بیان کی جاتی تھی۔جن میں خیالی قصے ہوتے تھے۔داستان میں عام طور حسن وعشق کی رنگینی واقعات وحادثات کی بہتات اور بیان کی لطافت ہوتی ہے۔داستان کا مقصد سننے والوں کو کچھ دیر کیلئے خوشی کا سامان مہیا کرنا ہے۔ درباروں میں داستان گو ملازم رکھے جاتے تھے۔ داستانیں قصّہ درقصّہ ہوا کرتی تھی۔اور داستان گوان کو قسط وار مہینوں سنایا کرتے تھے۔ان میں زیادہ تر خیالی قصےّ ہوتے تھے۔ پریوں،جنوؤں اور دیوؤں کے کارنامے بڑے حیرت انگیز طریقے میں بیان ہوتے تھے۔

داستان کا رواج اس زمانے سے شروع ہوا جب لوگوں نے دل جوئی کا سلسلہ شروع کیا۔ جنوبی ہندوستان میں لکھی گئی ملاّ وجہی کی ''سب رس'' اردو کی قدیم ترین داستان ہے۔شمالی ہندوستان میں لکھی گئی اردو کی پہلی داستان ''قصّہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔ نئے تہذیبی تقاضوں نے انسان کو خیالوں کی دنیا سے نکال کر حقیقی زمین پر چلنے پر مجبور کیا جس سے اردو کی یہ صنف زوال کا شکار ہوگئی۔ایک انسان جو چیزیں روزمرہ کی زندگی میں حاصل نہ کرسکا وہ چیزیں اس کو داستانوں میں مل گئی۔

میر امن کی حالات زندگی اور ادبی کارنامے

نام امیر امن اور تخلص لطفؔ تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ فورٹ دہلی میں حالات خراب ہوئے تو وہ کلکتہ پہنچے اور وہیں رہنے لگے۔ میر بہادر علی حسینی کی مدد سے ولیم کالج پہنچے اور گلکرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے فارسی کے مشہور ''قصّہ چہار درویش'' کو اردو میں لکھا اور ''باغ و بہار'' نام رکھا ۔''باغ و بہار'' فوراً ہی مقبول ہوگئی۔ اور آج تک اس کی شہرت اور مقبولیت برقرار ہے۔ میر امن کو اسی ''باغ و بہار'' کی وجہ سے اردو ادب و زبان میں بلند مقام حاصل ہوا اور اپنا نام زندہ اور روشن کر دیا۔ اس قصے کو نہایت ہی دلچسپ انداز اور آسان انداز میں لکھا ہے۔ ''باغ و بہار'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امن کو اردو زبان پر قدرت حاصل تھی۔

میر امن اپنے زمانے کے اہل قلم حضرات میں شمار ہیں جس کی مثال ان کی تحریر کردہ ''باغ و بہار'' ہے میر امن کو واقعات بگاری پیش کرنے میں بہت قدرت حاصل تھی۔ آپ کی عبارت میں بے کار کی پیچیدگی نہیں ملتی ہے۔ آپ کی عبارت میں عربی فارسی اور دیسی الفاظ کا ذخیرہ اور خزانہ ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی تحریر موثر نظر آتی ہے۔ اور آج بھی آپ کی تحریر کی داد دی جاتی ہے۔ اور اردو ادب کیلئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

داستان ''سیر چہار درویش کی''

کتابی سوالات:

''سبق باغ و بہار'' میں جو فقرے آئے ہیں ان کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے۔

خاطر جمع رکھنا = تسلی رکھنا

کنارہ پکڑنا = الگ ہونا

چھاتی پر سانپ پھرنا = رنج ہونا یا حسد ہونا

ٹھکانے لگانا= مار ڈالنا

روبکار ہونا= پیش آنا یا سامنے آنا

قول وقرار کرنا= وعدہ پورا کرنا

بغیر مارے مرجانا= بے موت مرجانا

اوپری دل سے= دکھاوے کے طور پر

جواب(۱) فرش پر سے پتھر ہٹانے کے بعد شہزادے نے زمین کے اندر ایک عمارت اور چار مکانات دیکھے۔ ہر ایک کے دالان میں سونے کی زنجیروں سے دس دس مٹکے لٹک رہے تھے۔ ہر ایک کے منہ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک جڑاؤ کا بنا ہوا بندر بیٹھا تھا۔ اس نے چاروں مکانوں میں چالیس گولیاں گن لی لیکن ایک مٹکا اشرفیوں سے بھرا پایا۔ اس پر نہ کوئی بندر تھا اور نہ ہی اینٹ رکھی تھی اور ایک حوض جواہرات سے بھرا دیکھا۔

جواب(۲) ملک صادق جنوں اور دیوؤں کا بادشاہ تھا۔ شہزادے کے والد نے جوانی کے وقت سے ہی ملک صادق کے ساتھ دوستی اور آمدورفت پیدا کی تھی۔

جواب(۳) ابوجہل ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا اور آپ ﷺ کو کافی تکلیفیں دیتا تھا۔ ابوجہل دینِ اسلام کی مخالفت کرتا تھا۔ شہزادے کا چچا بھی شہزادے کو جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا اسی لئے اسے ابوجہل سے مشابہت دی ہے۔

جواب(۴) یہ فقرہ میرامن کی داستان ''سیر چوتھے درویش کی'' سے ماخوذ ہے۔ چوتھا درویش اپنے تین ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میرے والد صاحب نے مرتے وقت اپنے بھائی کو وصیت کی کہ جب تک شہزادہ جواس تخت کا مالک ہے جوان اور باشعور نہ ہوجائے تم اس کی جگہ کام کرنا یعنی اس ساری رعایت پر حکومت کرنا مجھے امید ہے کہ تم میری رعایا اور سپاہیوں کو خراب نہ ہونے دوگے۔ اور جب شہزادہ جوان ہوجائے گا تو یہ تاج وتخت اس کے حوالے کر کے اس کی شادی اپنی بیٹی روشن اختر سے کرنا تا کہ بادشاہت ہمارے خاندان میں ہی قائم رہے۔ یہ کہہ کر میرے والد صاحب کی موت ہوگئی۔

خلاصۂ "سیر چہار درویش کی"

جب چاروں درویش اپنی اپنی آپ بیتی سناتے رہے تو چوتھا درویش اپنا قصّہ یوں بیان کیا کہ میں چین کے بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ سے سے واقف نہیں تھا۔۔۔۔ کی زندگی گزارتا تھا۔ میرے والے نے مرتے وقت مجھے میرے چچا کے حوالے کیا اور چچا سے وصیت کی جوشہزادہ جوان ہوجائے اس کی پرورش کرنا۔ اور جوان ہوکر اسے تخت کا مالک بنا کر اپنی بیٹی روشن اختر سے شادی کر دینا۔ چچازاد بہن سے شادی کی خبر سن کر میں بہت خوش ہوا۔ ایک دن ایک کنیز نے میرے منہ پر تھپڑ مارا میں روتا ہوا اپنے مرحوم والد کے خادم مبارک کے پاس گیا۔ وہ مجھے روتا دیکھ کر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے مجھ سے رونے کا سبب پوچھا اور کہا میرے خیال میں اب شہزادہ کی شادی کر دینی چاہیئے۔ وہ یہ بات اور پری دل سے کہتا تھا۔ اس نے دربار میں نجومیوں سے کہا کہ کون سا مہینہ شادی کرنا اچھا رہے گا۔ انہوں نے اگلے سال شادی کا فیصلہ دیا۔ دو تین دن گزرنے کے بعد میں مبارک کے پاس گیا مکھے عیکھ کر رونے لگا اور کہا کہ بادشاہ تم کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ میں مبارک کے قدموں پر گر پڑا اور۔۔۔۔ کی درخواست کی۔ مبارک مجھے اس جگہ لے گیا جہاں میرے والد بیٹھا اور سویا کرتے تھے۔ ہم نے اس جگہ کرسی ہٹا کر اس کے نیچے فرش اٹھایا اور زمین کھودی۔ اچانت وہاں ایک کھڑکی نمودار ہوگئی۔ اس زنجیر کے ساتھ تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے اندر چار مکانات اور ایک عمارت تھی۔ ہر ایک مکان کے دالار دس دس مٹکے لٹک رہے تھے۔ ہر ایک مٹکے کے منہ پر ایک سونے کی اینٹ اور جڑاو کا بنا ہوا بندر بیٹھا۔۔۔۔ ایک مٹکا جو کہ اشرفیوں سے بھرا پڑا تھا اس کے اوپر بندر نہیں تھا۔ میں نے مبارک سے سارا ماجرا دریافت کیا۔ مبارک نے کہا کہ میرے والد کی ملک صادق (جو جنوں کا بادشاہ ہے) سے دوستی تھی اور وہ انہیں یہی بندر تحفے پر دیتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں چالیسواں نہ ملے گا۔ چالیس پورے ہونے

پر ایک ایک بندر کے ہزار ہزار تابع ہوں گے۔ ہم جچھ بھی اسن کسے مانگے گے مل جائے گا۔ مبارت نے بادشاہ سے جھوٹ بولا کہ میں شہزادے کو مار ڈالوں گا۔ مبارک مکجھے ملک صادق کے پاس لے گیا اور ملک صادق کو سارا مراجرا سنایا۔ ملک صادق نے ہر طرح کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور کہنے لگا کہ اگر شہزادہ ایک کام بخوبی انجام دے گا اور کسی قسم کی خیانت کی تو میں اس کے ساتھ بادشاہوں جیسا سلوک کروں گا اور جو کچھ شہزادہ کہے گا دوں گا۔

افسانہ کی تعریف

اردو میں مختصر افسانہ وہی نثری صنف ہے جسے انگریزی میں شارٹ سٹوری کہا جاتا ہے۔ مختصر افسانہ کی بہت تعریفیں کی گئی ہے۔ مثلاً یہ ایک ایسا نثری قصہ ہے کہ جس کے پڑھنے میں آدھا گھنٹہ تک کا وقت لگے۔ یا مختصر افسانہ کسی آدمی کی زندگی کے سب سے اہم اور دلچسپ واقعہ کا بیان ہے۔ جو سنا گیا ہو۔ جو کسی کو پیش آ سکتا ہو۔ کسی نے اس کو ایک واقعہ کا بیان بھی کہا ہے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ صنف ہے۔ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے سماج اور فطرت کے طاقتوں سے کشمکش اس کا موضوع ہے۔ اس میں سماجی مسائل اور افراد کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ افسانہ میں زندگی کے کسی ایک پہلو کسی ایک واقعہ یا نفسیاتی حقیقت کو موثر طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک واقعہ ہی قاری کو توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ افسانہ میں آخر تک قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔ اس کا اختتام بھی موثر انداز میں ہوتا ہے۔ مغرب میں اس صنف کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا تھا۔ مغرب کے زیر اثر اردو میں اس کا آغاز بیسوی صدی کے اوائل میں ہوا۔

منشی پریم چند کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

اصل نام دھنپت رائے تھا لیکن افسانے کی دنیا میں منشی پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ولادت بنارس کے قریب ایک گاؤں پانڈیپور میں ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک کے محکمے کلرک تھے۔ پریم چند آٹھ برس کے تھے کہ ان کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔اس کے بعد دادی نے پرورش کی ذمہ داری سنبھالی لیکن جلد ہی ان کا بھی انتقال ہوگیا۔اس اثنا میں ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ اسطرح وہ کسی حد تک باپ کی محبت سے بھی محروم ہوگئے۔ پندرہ برس کے ہوئے تو ان کی شادی کر دی گئی۔اس وقت وہ نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔کچھ دنوں بعد والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔اور وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے پرائمیری سکول میں ملازمت کر لی اور ۱۹۳۶ء میں جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔

افسانے کے میدان میں ان کا مرتبہ اور بھی بلند ہے۔ پریم چند کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ان کے مشہور و مقبول افسانے ''قاتل کی ماں'' ''زیور کا ڈبہ'' ''گلی ڈنڈا'' ''نمک کا داروغہ'' اور ''کفن'' بہت مشہور ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔''پریم پچیسی'' ''پریم چالیسی'' ''واردات'' وغیرہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں طنز و طرافت کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ان کی زبان نہایت شائستہ اور رواں ہے۔سادگی کو جوہر ہے۔

سوالات کے جوابات:

جواب(۱) پنڈت چندر دھر ایک استاد تھا۔اس کی ماہوار آمدنی صرف پندرہ روپیہ تھی۔اتنی کم تنخواہ اور آمدنی سے اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔اس کو کسی قسم کا کوئی بھی آرام میسر نہیں تھا۔دوسرا اس پیشے میں ترقی بہت کم تھی اور کبھی تو ترقی ہوتی ہی نہیں۔اسی لئے وہ اپنے پیشے سے بے زار تھا۔

جواب(۲) داروغہ جی کا پنڈت جی کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہ تھا۔پنڈت جی سیدھے سادھے آدمی تھے۔داروغہ جی کبھی کبھی ان پر ترس کھا کر ہمسایگی کا حق ادا کرتا تھا۔کبھی سیر آدھ سیر دودھ اور کبھی ترکاریاں بجھوا دیتا تھا۔مگر اس کے وعوض پنڈت جی کو ٹھاکر صاحب کے دو اور منشی جی تین لڑکوں کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔

جواب(۳) پنڈت جی اور داروغہ جی نے سفر کے دوران ریل کے ڈبہ میں دو آدمیوں کو دیکھا۔ داروغہ جی نے لیٹے ہوئے مسافر سے جگہ چھوڑنے کیلئے کہا مگر اس نے انکار کیا اور کہا کہ تم نے مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر پچیس روپے لیکر مجھے چھوڑا۔پھر داروغہ جی نے دوسرے مسافر سے جگہ چھوڑنے کو کہا۔اس نے داروغہ جی سے کہا کہ تم نے میلے میں میری پٹائی کی تھی اور دھکا دے کر داروغہ جی کو گاڑی سے باہر کر دیا۔اس طرح داروغہ جی کو سفر کے دوران بے عزتی سے دوچار ہونا پڑا۔

جواب(۴) کرپا شنکر پنڈت جی کا شاگرد رہ چکا تھا۔اور اس نے مسافروں کو اپنے گھر لے لیا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی آگ جلوادی، پلنگ بچھوا دیے اور کھانا پکوایا۔کرپا شنکر نے خاطر مدارات میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ وقت رخصت کرپا شنکر کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے اور اس نے پنڈت جی کے قدم چھوئے۔

جواب(۵) پنڈت جی کو اپنے پیشے کی عظمت کا احساس اس وقت ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ داروغہ جی اور منسی صاحب کے ساتھ ان کے جاننے والوں نے کیسا برتاؤ کیا اور اس کے مقابلے میں کرپاشنکر نے پنڈت جی کی کتنی عزت کی اور خدمت کی جس کی وجہ سے پنڈت جی کو اپنے پیشے کی قدر و قیمت کا احساس ہوا اور اس کے بعد پنڈت جی نے اپنی تقدیر کا شکوہ کبھی بھی نہیں کیا۔

جواب(۶) عبرت سے مراد سبق حاصل کرنا یا نصیحت پکڑنا ہے۔ چونکہ ٹھاکراتی بل سنگھ کانسٹبل ہونے کے باوجود بھی اس کا برتاؤ لوگوں کے تئیں اچھا نہیں تھا۔ بیچ ناتھ بھی رشوت لیکر لوگوں کو تنگ کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان دونوں کو بہت بے عزتی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے برعکس پنڈت جی کو اجودھیا میں عزت ملی۔ جو کام ٹھاکراتی بل سنگھ اور منشی جی روپے پیسے ہونے کے باوجود نہ کر سکے۔ پنڈت جی کے مہربانہ سلوک سے اور اچھے اخلاق کی وجہ سے وہ کام ہوا۔ جس کی وجہ سے پنڈت جی کو ایک عبرت ناک سبق حاصل ہو۔ اسی وجہ سے اس افسانے کا نام عبرت رکھا گیا ہے۔

افسانہ عبرت میں درج شدہ چند محاوروں کے معنی مندرجہ ذیل ہے۔

نذر کرنا بمعنی عطا کرنا یا کسی کو دینا

ایک نہ سننا بمعنی بالکل نہ سننا

چھاتی پیٹنا بمعنی افسوس کرنا

افاقہ ہونا بمعنی فرق ہونا

خواجہ حیدر علی آتش کی حالات زندگی اور ادبی کارمانے

نام خواجہ حیدر علی اور تخلص آتش تھا۔ ۱۷۷۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا جس کی بنا پر ان کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت نے انہیں جلدی نواب محمد تقی خان ترقی کے دربار تک پہنچا دیا۔ نواب ترقی کے ساتھ وہ لکھنؤ آ گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کے مزاج میں ایک فقیرانہ انداز تھا۔ جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا۔ تقریباً تمام زندگی انہوں نے تنگی تُرشی کے ساتھ گزاری اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ آخری عمر میں ان کی بینائی چلی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ادھر اُدھر آنا جانا ترک کیا تھا۔ آخر ۷۰ سال کی عمر میں ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

آتش کے مزاج میں جو قلندرانہ شان تھی۔ وہ ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کا لہجہ بلند آہنگ ہے۔ وہ چھوٹی سی بات کو بھی بڑی دھوم دھام سے کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان کی خوبصورتی اور خیال کا اچھوتا پن پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ ان کی پیش کش سادہ اور شگفتہ ہے۔

غزلیات خواجہ حیدر علی آتش

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

آتش فرماتے ہیں کہ کافی انتظار کے بعد جب مجھے محبوب سے ملاقات کا موقع ملتا تھا تو ان کے منہ پر عجیب قسم کی شک وشبہات کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور یہی شک کی باتیں ہم دونوں کے درمیان ایک دیوار بن گئی جس کی وجہ سے ہم کبھی بھی کھل کر بات چیت نہ کر سکے۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

آتش کہتے ہیں کہ اس دنیا کی زمین پر کیا کیا گل کھلتے ہیں یعنی فسادات کھڑے ہوتے ہیں۔ پیڑ پودے پھل پھول اگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک انسان بھی اسی زمین کے اندر مدفن ہوتا ہے۔ اور ہمارے اور پر جو آسمان ہیں وہ بھی ہر وقت تبدیلیاں برپا کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت آسمان رنگ بدلتا رہتا ہے اور یہ رنگ بدل دینا یعنی تبدیلیاں دنیا کا دستور ہیں۔

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

آتش اس شعر میں دنیا کی ناپائداری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ سکندر اعظم ایک بہت بڑا بادشاہ ہو کر ساری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی قبر کا کہیں بھی نام و نشان نہیں ہے اور نہ ہی دارا کی قبر کا کہیں نام و نشان ہے۔ وقت کے طوفان نے کیسی کیسی مشہور ہستیوں کے نام و نشان مٹائے۔ اصل میں یہ دنیا فانی ہے۔ اس دنیا میں کتنی بڑی بڑی ہستیاں آئیں اور چلی گئی۔

دل و دیدہ اہل عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی بڑائی بیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب تمہارے کتنے گھر ہیں۔ یعنی تم کتنے مکانوں میں رہتے ہو۔ تم دنیا والوں اور ان کی آنکھوں میں رہتے ہو۔ تمام دنیا والوں کی آنکھیں اور دل تمہارے گھر ہیں یعنی بسنے اور رہنے کی جگہیں ہیں۔

غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

اس شعر میں آتش اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ اگر تمہارے اتنے مکانات ہیں تو دیکھو میرے بھی بہت سارے دوست اور احباب ہیں جن کو میں نے اپنی زندگی کا ساتھی بنالیا ہے۔ زندگی میں مجھے غم، پریشانیاں، تکالیف، مصائب اور ناامیدی کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔ لہٰذا میں نے ان ہی کو اپنے مہربانوں میں شامل کیا۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب(۱) اس غزل میں جس شعر میں انسان کی بے ثباتی کا ذکر ہے وہ درج ذیل ہے۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

جواب(۲) شاعر حیدر علی آتش عشق میں ہمیشہ ناکام ہوا ہے۔ اور اس کو زندگی میں ہمیشہ پریشانیاں ہی ملی ہیں۔ وہ پریشانیوں اور ناامیدیوں کا سامنا کرنے کا عادی بن گیا ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی ان ہی چیزوں کے ساتھ گزارتا ہے اور ہمیشہ ان ہی کو ساتھ پاتا ہے۔ اس لئے شاعر نے غم وغصہ ورنج واندوہ وحرماں کو اپنے مہربانوں میں شمار کیا ہے۔

نظم "شکستِ انتظار" مرزا محمد یاسین بیگ

گلی کے موڑ پہ مسجد کے مینار تلے خزاں رسیدہ رسیدہ چناروں کے زردرو پتے
چراغ راہ کی مانند صبح و شام جلے

یہ اشعار مرزا محمد یٰسین بیگ کی نظم ''شکستِ انتظار'' سے لئے گئے ہیں۔شاعر کہتے ہیں کہ گلی کے اس موڑ کے مینار کے نیچے زرد پتے پڑے ہوئے ہیں۔جن پر خزاں کا اثر ہوا ہے۔وہ پتے اس طرح چمکتے ہیں جس طرح راستے کا چراغ صبح وشام اور رات دن جلتا رہتا ہے۔

کہر میں لپٹی ہوئی ملگجی مضاؤں میں نظر نواز نظاروں کے داغ تک نہ ملے

محمد یاسین بیگ کہتے ہیں کہ فضائیں میلی اور دھند میں لپٹی ہوئی ہیں۔جن کی وجہ سے نظر کو سرفراز کرنے والے نظاروں کا نام ونشان نہیں ملتا ہے۔

سیاہ رات کے دامن سے تیرگی نہ چھٹی فلک پہ جلتے ستاروں کے داغ تک نہ ملے

محمد یٰسین بیگ کہتے ہیں کہ کالی رات کے دامن سے اندھیرا ختم ہی نہیں ہوتا اور آسمان پر بھی ستارے نہیں ہیں۔اندھیرے کی وجہ سے وہ ستارے بھی نظر نہیں آتے ہیں۔

گلی کے موڑ پہ اس سامنے کی کھڑکی میں وہ قیس منتظر و بے قرار بیٹھا ہے

محمد یاسین بیگ کہتے کہ گلی کے موڑ پر سامنے والی کھڑکی میں مجنون جو کہ لیلیٰ کی محبت میں پاگل ہے انتظار کرتا رہتا ہے اور اس کا دل نہایت بے قرار ہے۔

نظر نظر میں شراروں کا اضطراب لئے دھڑکتے دل سے سرراہ گزار بیٹھا ہے

محمد یٰسین بیگ کہتے ہیں کہ مجنوں کی ہر ایک نظر میں چنگاریوں کا اضطراب یعنی بیچینی اور بے قراری کا دل دھڑکتا رہتا ہے۔اسی بے قراری کے عالم میں وہ راستے پر بیٹھا ہوا ہے۔

اسے خبر نہیں شاید کہ محمل لیلےٰ گزر گیا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا

محمد یٰسین کہتے ہیں کہ مجنوں کو شاید معلوم نہیں کہ لیلیٰ کا کجاوہ یعنی اونٹ پر سجی ہوئی ڈولی وہاں سے گزر گئی اور کبھی واپس نہیں آئے گی اسی طرح جس طرح بہار اپنے اختیارات خزاں کو دے جاتی ہے پھر لوٹ کر واپس اسی شکل میں نہیں آتی ہے۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب(۲) موسم خزاں کی طرح نا امیدی دھندلی ہوئی اور اداس سی لگتی ہے۔نظم ''شکست انتظار'' میں اسی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے۔محمد یاسین بیگ نے بہار کا ذکر کر کے امید کے فلسفہ کو اجاگر کیا ہے اور خزاں کا ذکر کر کے نا اُمیدی کا خاکہ پیش کیا ہے۔

جواب(۳) کھڑکی میں بیٹھے ہوئے قیس سے مراد عاشق ہے اور محمل لیلےٰ سے مراد محبوبہ ہے جو اونٹ کے اوپر رکھی ہوئی ڈولی میں بیٹھی ہے۔مختصراً نا امیدی مایوسی اور اداسی کی اس فضا میں بھی کسی کھڑکی میں بیٹھا کوئی عاشق یعنی مجنون کسی محبوبہ کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اسے وصل کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لیلےٰ کی ڈولی چلی جائے گی لیکن واپس نہ آئے گی۔لہٰذا وہ فضول اور بے فائدہ اس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

قطعہ کی تعریف

بغیر مطلع کے مسلسل غزل یا قصیدہ کو قطعہ کہتے ہیں۔قطعہ کے لفظی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ ابتداء میں اس کو قصیدہ کا حصّہ تصور کیا جاتا تھا۔لیکن اب یہ مستقل صنف بن گئی ہے۔آج کل اس کو عروج حاصل ہوا ہے۔اس میں غزل اور قصیدہ کی طرح عام طور پر مطلع نہیں ہوتا صرف قافیہ اور ردیف کا خیال رکھا جاتا ہے۔قدیم شعراء کے کلام میں دو یا دو سے زیادہ اشعار کو قطعہ کہا جاتا ہے۔ جدید شاعری میں دو اشعار یا چار مصرعوں کے قطعہ کو آزاد اور علیٰحدہ صنف سخن مانا گیا ہے۔قطعہ میں اکثر دو یا چار اشعار ہوتے ہیں۔اور زیادہ سے زیادہ سترہ اشعار ہوتے ہیں۔قطعہ میں ہر قسم کے مضامین بیاں کئے جاتے ہیں۔عام طور پر قطعات میں اخلاقی اور نصیحت آمیز باتیں لکھی جاتی ہیں۔ میرؔ،سوداؔاور نظیرؔ اکبرآبادی کے قطعات معروف ہیں۔

قطعہ ”نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام“ از مولانا الطاف حسین حالیؔ

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر　　درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں

یہ شعر مولانا الطاف حسین حالیؔ کے قطعہ ”نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام“ سے لیا گیا ہے۔مولانا حالیؔ کہتے ہیں ایک مالک ہمیشہ اپنے نوکروں پر سختی اور ظلم کرتا تھا۔ وہ مالک اپنے نوکروں کو نہ کبھی معافی دیتا تھا اور نہ ہی کوئی رعایت اور رحم کرتا تھا۔

بے سزا کوئی خطا ہرتی نہ تھی ان کی معاف کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی ان کے تئین

مولانا الطاف حسین حالؔی کہتے ہیں کہ نوکروں کی غلطی سزا کے بغیر معاف نہیں کی جاتی تھی۔ ان کو اپنے کام سے کبھی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ ہر وقت وہ اپنے مالک کا کام کرتے رہتے تھے۔

حسن خدمت پر اضافہ یا صلہ تو در کنار ذکر کیا نکلے جو پھوٹے منہ سے اس کے آفرین

جب بھی نوکر اچھی طرح سے خدمت کرتا تھا تو کبھی بھی اس نوکر کو انعام نہیں دیا جاتا تھا۔ مالک کے منہ سے کبھی بھی شاباشی کے دو الفاظ بھی نہیں نکلتے تھے۔ انعام کی تو بات ہی نہیں۔

پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے اس سے جب دوچار نتھنے پھولے، منہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابو یہ چیں

جب کبھی نوکر اپنے مالک کے سامنے آتے تھے تو ہر وقت مالک کو سخت غصے میں دیکھتے تھے۔ غصے کی وجہ سے ان کے مالک کے ساتھ پر بل یعنی شکن اور ابرو کھینچے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی بھی ان کا مالک مسکراتا ہوا نظر نہیں آتا تھا یعنی وہ ہر وقت غصّے میں ہوتا تھا۔

تھی نہ جز تنخواہ نوکر کیلئے کوئی فتوح آگے ہو جاتے تھے خاین جو کہ ہوتے تھے امین

نوکر کیلئے تنخواہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ ہوتا تھا لہٰذا جو بھی نوکر امانت دار ہوتا تھا وہ یہاں آ کر خیانت دار بن جاتا تھا کیونکہ تنخواہ کے بغیر ان کو کوئی بھی معاوضہ نہیں ملتا تھا یعنی ان کو ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں ملتا تھا۔

رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس فرض جس میں نوکر اور آقائے ہوتے تھے تعین

مولانا الطاف حسین حالی کہتے ہیں کہ ہر ایک نوکر کے پاس ایک شرائط نامہ ہوتا تھا جس مین مالک اور نوکر کے فرائض درج ہوتے تھے۔

گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار زہر کے پیتا گھونٹ آخر بجائے انگبیں

اگر کوئی نوکر کسی قسم کی رعایت کا طلب گار ہوتا تھا تو مالک کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ میٹھی بات کے بجائے زہر کے گھونٹ پیتا تھا اور بڑی مشکل سے ناگوار چیز برداشت کرتا تھا۔

حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھاؤ تا کہ یہ درخواست دیکھے واجبی ہے یا نہیں

اس کے بعد مالک حکم دیتا تھا کہ ہم شرائط نامہ دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ ہم دیکھیں کہ یہ درخواست ٹھیک ہے یا نہیں یعنی نوکروں کی یہ درخواست ضروری ہے یا غیر ضروری۔

واں سوا تنخواہ کے تھا جس کا آقا ذمہ دار تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں

مولانا الطاف حسین حالی کہتے ہیں کہ شرائط نامہ میں تنخواہ کا ذمہ دار مالک ہوتا تھا باقی ساری ذمہ داریاں اور شرطیں نوکروں کے ذمے ہوتی تھیں۔

دیکھ کر کاغز کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارے آستین

اس کے بعد شرائط نامہ دیکھ کر نوکر لاجواب ہوتے تھے۔ لیکن وہ سب نوکر آقا یعنی مالک کے چھپے ہوئے دشمن تھے۔ مالک کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ سارے نوکر اپنے مالک کے پیٹھ پیچھے برائی کرتے رہتے تھے۔

ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنین

مولانا الطاف حسین حالؔی کہتے ہیں کہ ان نوکروں کا مالک ایک شرارتی گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کو روکنے کے لئے مالک نے کافی زور لگایا اور اس کے نازک ہاتھ گھوڑے کو روکتے روکتے تھک گئے۔

دفعتاً قابو سے باہر ہوکے بھاگا راہوار اور گرا اسوار صدرزیں سے بالائے زمین

اچانک وہ گھوڑا قابو سے باہر ہوگیا اور بہت تیز بھاگا۔سوار یہاں مراد نوکروں کے مالک سے ہیں زمین پر گر پڑا۔

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب کی نظر سائیس کی جانب کہ ہوا آکر معین

مالک نے بہت کوشش کی کہ رکاب سے اس کے پاؤں الگ ہوں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ وہ صرف گھوڑے والے یعنی نوکر کی طرف دیکھتا تھا کہ شاید وہ آکر اس کی مدد کرے۔

تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا دیکھتا تھا اور اس سے مس نہ ہوتا تھا لعین

گھوڑے والا یعنی نوکر بہت سنگ دل اور بے رحم و بے وفا تھا۔ مالک نوکر کی طرف مدد کے لئے دیکھتا تھا لیکن لعین نوکر پر اس کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

گھوڑے والا یعنی نوکر مالک کو دور سے ہی شرائط نامہ دکھاتا رہا اور کہتا رہا کہ اے مالک اس کاغذ میں ایسی کوئی شرط لکھی ہوئی نہیں ہے کہ میں تمہاری جان بچاؤں۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب (۱) حالؔی کے نزدیک نوکروں پر کبھی بھی ظلم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نوکر بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ ایک مالک کو چاہئے کہ وہ نوکروں کو مناسب اور اچھی تنخواہ دیں اوران سے پیار اور محبت سے پیش آئے۔ اگر ہم ان کے ساتھ ہمدردی اور پیار سے پیش آئیں گے تو وہ ہماری خدمت یعنی مالک کی خدمت سچے دل سے کریں گے۔ اور اپنے مالک کے لئے اپنی جان قربان کر سکتے ہے۔ اگر نوکروں کے ساتھ ہمدردانہ طریقہ اور سلوک نہ اپنایا جائے تو ہمارا حال بھی اس آقا جیسا ہوگا جس کا قصہ اس نظم ''نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام'' میں بیاں کیا گیا ہے۔

جواب (۲) ہمیں اپنے ماتحتوں کے تعین ہمدردی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ اگر ہم ان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں گے اوران کا خیال رکھیں گے وہ ہماری خدمت سچے دل سے کریں گے اور ہمارے صحیح معنوں میں وفادار ہوں گے۔

جواب (۳) ایک مالک اپنے نوکروں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ وہ نوکروں کی غلطی کبھی بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ ہر نوکر کے پاس ایک شرائط نامہ ہوتا تھا جس میں مالک اور نوکر کے فرائض درج تھے۔ اگر کبھی کوئی نوکر رعایت کی درخواست کرتا تھا تو مالک وہ شرائط نامہ نوکر کو دکھاتا تھا۔ اور نوکر شرائط نامہ دیکھ کر خاموش رہ جاتا تھا۔ ایک دن مالک ایک شرارتی گھوڑے پر سوار ہوا جس کی رفتار بہت تیز تھی۔ گھوڑا دوڑتے دوڑتے بے قابو ہو گیا مالک نے بہت کوشش کی کہ گھوڑا رک جائے مگر وہ ناکام ہوا۔ مالک گھوڑے سے گر پڑا اور نوکر کی طرف مدد کیلئے دیکھتا رہا۔ وہ سنگ دل اور بے رحم نوکر دور سے ہی مالک کو شرائط نامہ دکھاتا رہا اور مالک سے کہتا رہا دیکھو سرکار تم کو بچانے کی شرط اس میں درج نہیں ہے۔ میں آپ کو کیسے بچاؤں گا۔

جواب (۴) الف) بہت کوشش کی لیکن پاؤں سے رکاب نہ چھوٹی

ب) آخر سائیس کی جانب نظر کی کہ معین ہو۔

ج) مرا سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا تھا۔

د) لعین دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی کی زندگی اور ادبی خدمات

خواجہ الطاف حسین حالؔی پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایزد بخش کا انتقال آپ کی کم عمری یعنی نو برس میں ہوا۔ آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائی نے کی۔ روزی روٹی کے لئے آپ دہلی آئے اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ رئیس جہانگیر آباد سے جان پہچان ہوئی۔

انہوں نے آپ کو اپنے بچوں کا استاد مقرر کیا۔شروع میں حالؔی نے دلی کے اینگلو عربک اسکول میں فارسی پڑھائی اور پھر لاہور کے تعلیمی بُک ڈپو میں کام کرنے لگے۔اور یہاں مولوی محمد حسین آزاد کے ساتھ کام کرتے رہے۔ان ہی کے اشاروں پر حالؔی قدرتی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔اردو نثر میں قابل قدر تصانیف ''یادگارِ غالب'' حیات سعدؔی اور ''حیات جاوید'' ہیں۔اردو تنقید کی پہلی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' ہے۔غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں زیادہ مشہور ہیں۔جن میں مسدس، مرثیہ غالبؔ، مناجات بیوہ قابل ذکر ہیں۔ مدو جزرِ اسلام میں حالؔی نے مسلمانوں کی عروج وزوال کی داستان بیان کی ہے۔سرسید احمد خان نے اس نظم کو آپکے نیک اعمال میں شمار کیا ہے۔حالؔی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عورتوں کی ہمدردی میں مناجاتِ بیوہ اور چپکی داد جیسی جیسی نظمیں لکھی۔آپ نے ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں انتقال فرمایا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

Part B

ڈراما کی تعریف

ڈراما ادب کی اہم ترین اصناف میں شمار ہوتا ہے۔نقل کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کوئی بھی قوم مہذب ہو یا غیر مہذب یہ خوبی اس میں ضرور پائی جاتی ہے۔ بچے لڑکپن میں بڑوں کی نقل کرتے ہیں۔ جوان بوڑھوں کے نقش وقدم پہ چلتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے تاثرات اور حرکات کی نقل کرتے ہیں۔جس سے ڈراما وجود میں آتا ہے۔یعنی ڈراما انسان کے جذبہ نقالی ہی کا اظہار ہے۔ڈرامے کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے۔اس فن کا مقصد نہ صرف زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے بلکہ سیاسی ، اخلاقی ، معاشرتی، نفسیاتی اور مذہبی اعتبار سے انسان کی اصلاح کرنا بھی ہے۔ڈرامانہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اسٹیج پر عملی صورت اختیار کرتا ہے۔

ڈرامے کا سب سے زیادہ اہم جز پلاٹ یا کہانی ہوتا ہے۔اس کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کا تعلق زندگی سے ہو۔ یہ حقیقت پر مبنی ہو۔اس میں واقعات کی ترتیب اس طرح ہونی چاہئے کہ ایک تو ہر آنے والا واقع اس سے پہلے واقعے کے ساتھ مکمل طور پر جڑا ہو۔دوسرے یہ ہے کہ پہلے واقع سے زیادہ متاثر کرے۔

ڈرامہ نگار کا فرض ہے کہ وہ ایسے کردار اور اشخاص چنے جن سے اُسے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ڈرامے میں کام کرنے والوں کا کام ایسا ہونا چاہئے کہ دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔

ڈرامے کا تیسرا جز مکالمہ یعنی زبان و بیان ہے۔ڈرامے میں مکالمہ نگاری ایک بڑا فن ہے۔دراصل مکالمہ سے ہی کرداروں کے اخلاق، اوصاف اور عیوب وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔

کتابی سوالات کے جوابات:

جواب۱) جنگل میں پیڑ کاٹتے ہوئے لکڑہارے نے درخت کی ڈراونی آواز سُنی۔اس آواز سے سارا جنگل گونج اٹھا۔درخت نے کہا کہ مجھے مت کاٹو۔میں وقت آنے پر تمہیں انعام دوں گا۔

جواب۲) لکڑہارے کی بیوی صفائی کر رہی تھی۔یہ دیکھ کر لکڑہارے نے کہا کہ تمہاری روز روز کی صفائی سے فرش خراب ہو جائے گا۔یہ سن کر بیوی کو غصہ آیا اور بولی کہ میری جیسی بیوی کسی اور کو مل جاتی تو میرے پاؤں دھو دھو کے پیتا۔تم نے کیچڑ بھرے پیروں سے ساری صفائی خراب کر دی۔اس طرح میاں بیوی میں تو تو میں میں شروع ہونے لگی۔

جواب۳) بوڑھے نے لکڑہارے کے گھر آ کر کہا کہ میں جنگلی ہوں اور شام ہونے سے پہلے جنگل واپس پہنچنا ہے۔مختصراً بات یہ ہے کہ اس نیک آدمی نے میرے پرانے دوست پر بڑی مہربانی کی ہے۔جس کے عوض جنگل کا بادشاہ اس کی تین منہ مانگی مراد پوری کرنا چاہتا ہے۔

جواب۴) لکڑہارا کام سے تھکا ہوا گھر لوٹا تھا اور اُسے کافی زوروں کی بھوک لگی تھی۔اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔اس لئے اس نے بورکا لڑو مانگا۔

جواب۵) لکڑہارے کی بیوی اسے بار بار مال و دولت مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔

جواب ۶) بوڑھے آدمی کے نذدیک سب سے بُری دولت ہنسی ہے جس کی وجہ سے ہر گھر میں خوشی مسرت اور سکون ہوتا ہیں۔

جواب ۷) اس ڈرامے کا بنیادی موضوع ماحولیات ہے۔ ماحول کا توازن برقرار رکھنے میں درخت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ توازن بگڑ جائیں تو ماحول میں آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ اس ڈرامے سے درج ذیل اسباق حاصل ہوتے ہیں۔

الف) لالچ بری بلا ہے جس کا انجام ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔

ب) ہمیں ہر وقت مال و دولت کی نہیں بلکہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے ہمیں جنگلوں کی حفاظت کرنی چاہئے۔

ج) بات بولنے سے پہلے اسے تولنا چاہئے۔ ہر وقت سمجھداری سے کام لینا چاہئے۔

د) آپس میں لڑنے سے نقصان ہوتا ہے۔

ہ) مال و دولت ملنے پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔

ڈرامہ میں درج شدہ محاورات کے جملے:

محاورہ: پاؤں دھو دھو کر پینا بمعنی بے حد احترام کرنا

جملہ: ہم اگر اپنے والدین کے پاؤں دھو دھو کر بھی پی لے تو کم ہے۔

محاورہ: ڈر کے مارے کانپ اٹھنا بمعنی خوف سے لرز جانا

جملہ: حمید کی حادثے کے بعد حالت دیکھ کر میرا دل ڈر کے مارے کانپ اٹھا۔

محاورہ: منہ دھو رکھنا بمعنی امید چھوڑ دینا

جملہ: احمد نے در در کی ٹھوکریں کھا کر سرکاری نوکری ملنے سے اب منہ دھو رکھا۔

محاورہ: خاک میں ملنا بمعنی ضائع ہو جانا

جملہ: امجد نے دسویں جماعت میں ناکامی حاصل کر کے اپنی عزت خاک میں ملائی۔

محاورہ: بے سر پیر اڑانا بمعنی غلط بات کہنا

جملہ: جو انسان بے سر پیر کی اڑاتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

محاورہ: کانٹے بونا بمعنی برائی کا کام کرنا

جملہ: جو انسان دوسروں کے لئے کانٹے بوتا ہے وہ ان میں خود پھنس جاتا ہے۔

محاورہ: پیٹ میں چوہے دوڑنا بمعنی بہت بھوک لگنا

جملہ: انعام کے پیٹ میں کھا کر بھی چوہے دوڑتے رہتے ہیں۔

خلاصہ ڈراما "بور کے لڈو"

ایک گاؤں میں ایک لکڑہارا اور اس کی بیوی رہتی تھی۔ دونوں ہر وقت بات بات پر لڑتے رہتے تھے۔ ایک دن جب لکڑہارا لکڑیاں لیکر گھر آیا اس کی بیوی جھاڑوں دے رہی تھی۔ لکڑہاتے نے بیوی سے کہا کہ روز روز کی صفائی سے فرش خراب ہو جائے گا۔ یہ سن کر بیوی کو غصہ آیا اور دونوں میں لڑائی ہوئی۔ اصل میں لڑائی پیسوں کی تھی۔ بیوی کے پاس کھانا پکانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ لکڑہارے نے پیسے نہ لانے کی وجہ بتائی کہ میں جنگل میں ایک درخت کاٹنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک آواز آئی کہ مجھے مت کاٹو۔ اس کے بدلے میں تمہیں انعام سے نوازوں گا۔

میاں بیوی اس تکرار میں تھے کہ باہر سے کسی نے دروازے کی زنجیر ہلائی اور چھوٹے قد کا بوڑھا آدمی اندر آیا۔ جو سبز لباس پہنے ہوئے تھا اور کہا کہ میں جنگل سے آیا ہوں۔ اس لکڑہارے نے میرے دوست پر بہت بڑی مہربانی کی اس لئے میں اس کو انعام دینے آیا ہوں۔ میں اس کی تین مرادیں پوری کروں گا۔ بیوی نے بوڑھے آدمی سے کہا کہ انعام مجھے ملنا چاہئے۔ لکڑہارے نے

ایک گرما گرم بور کا لڈو مانگا۔اسی وقت اس کے ہاتھ میں ایک گرما گرم لڈو آیا۔اس پر میاں بیوی نے لڑنا شروع کیا۔اور بیوی لڈو لیکر دور چلی گئی۔اور کہا کہ ہم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ہم کو مال و دولت چاہیئے۔لکڑہارے نے دوسری مراد مانگی کہ لڈو اس کی بیوی کی ناک پر چمٹ جائے۔لڈو بیوی کی ناک پر چمٹ گیا۔آخر کار لکڑہارے نے تیسری مراد مانگی کہ بیوی کی ناک پر سے لڈو ہٹ جائے۔لڈو ناک سے الگ ہوگیا۔اور دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔یہ سب کچھ دیکھ کر بوڑھا ہنسا اور کہا کہ میں تمہیں کہا تھا جو کچھ بھی مانگو گے سوچ سمجھ کر مانگنا۔اب افسوس کرنے سے کوئی بھی فائدہ نہیں۔

اصل میں تم دونوں کو ''ہنسی اور خوشی'' کی ضرورت ہیں۔خوش ہوکر زندگی گذارنا بہتر زندگی کی علامت ہے۔یہ کہہ کر بوڑھا آدمی غائب ہوگیا۔

محمد عمر نورالہی کی حالت زندگی اور ادبی خدمات

محمد عمر نورالہی ۱۳۰۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔بچپن میں ہی والدین کا انتقال ہوجانے کی وجہ سے آپ کی پرورش آپ کے نانا جان نے کی۔۱۸۹۴ء میں ان کے نانا بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب آپ کی پرورش آپ کی بے اولاد خالہ کے حصّے میں آئی۔جس نے بڑی شفقت ومحبت سے آپ کو پروان چڑھایا۔۱۹۰۵ء میں آپ نے رنبیر ہائی اسکول جموں سے مٹرک کا امتحان پاس کیا اور مذید تعلیم کے لئے لاہور کے فارمن کرسچن کالج میں داخلہ لیا۔مدت کے بعد میاں فضل الہی کی بیٹی سے آپ کی نسبت قرار پائی۔آپ جموں وکشمیر ہائی کورٹ میں مترجم کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

آپ کو بچپن سے ہی علم حاصل کرنے کی لگن تھی۔آپ نے پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ملازمت کی گوناگو مصروفیات کے باوجود آپ نے منصفی کا امتحان پاس کرکے قانون کی سند حاصل

کر لی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۶ء تک آپ بطور جج مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں سب جج کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اور اس کے بعد آپ وکالت کرتے رہے۔

محمد عمر کا انتقال ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی صبح کو دل کی حرکت بند ہونے سے ہوا اور جموں میں قلعہ باہو کے سامنے قبرستان پیر دقادر بخش میں سپرد خاک کیے گئے

آپ نے نہ صرف ڈرامے لکھے ہیں بلکہ انہیں اسٹیج پر بھی لایا ہے۔ آپ کے علمی اور ادبی کارناموں میں ''ناٹک ساگر'' مشہور و معروف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۴ میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد ڈرامے، افسانے، تنقیدی مضامین اور نظم پارے ریاستی اردو ادب کو آپ کی دین ہیں۔

شاؔد عظیم آبادی کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

نام علی محمد اور تخلص شاؔد تھا۔ آپ ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر سے ہی تعلیم شروع کی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھتے رہے۔ آپ بچپن سے ہی ذہین تھے۔ اور اچھے اساتذہ کی تربیت سے ایک اچھے شاعر بنے۔ اسلامی تعلیم کے علاوہ آپ عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابیں بھی پڑھتے رہے۔ علمی خدمات کے لئے حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ آپ ۱۹۲۷ء میں اس دنیا سے چل بسے۔ نثر و نظم دونوں میں شاؔد ماہر جانے جاتے تھے۔ آپ کی غزلوں کا دیوان آپ کی وفات کے بعد آپ کے ایک شاگرد حمید عظیم آبادی نے جمع کر کے ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع کیا۔ شاؔد نے مثنوی، غذل، قصیدہ مرثیہ پر بھی قلم اٹھایا لیکن آپ غزلوں میں کافی مشہور ہے۔ آپ کی غزلیں ترنم اور لطافت سے بھری ہوئی ہیں۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔

غزلیات شاد عظیم آبادی

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

غزل کے اس مطلع میں شاعر شاد عظیم آبادی کہتے ہیں کہ جس طرح ایک بچے کو کھلونے دے کر اس کا دل بہلایا جاتا ہے اور اس کو ان کھلونوں سے خوش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اس دنیان میں لا کر بہت سی تمناؤں میں پھنسایا گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس دنیا میں آ کر کچھ اچھے ہی کام کر لیتا مگر دنیا کی تمناؤں میں پھنس کر میں نے کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔

ہوں اس کوچے کے ہر ذرہ سے آگاہ اُدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

شاد کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کی گلی سے واقف ہوں۔ میں اس کے گھر کے کونے کونے کو جانتا ہوں۔ اس کی گلی کی ہر چیز سے بہت اچھی طرح سے واقف ہوں کیونکہ ایک عرصہ سے یہاں آتا رہتا ہوں اور محبوب کے ہر راز سے واقف ہوں۔

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونق بزم میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

شاد کہتے ہیں کہ میرے دل کی بیقراری سے پوچھ لے کہ کیا میں یہاں اس مجلس میں خود آیا ہوں۔ دراصل میں یہاں خود نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے یہاں لایا گیا ہے۔ میں اس دنیا کے حسن و رونق اور چہل پہل کو دیکھنے کیلئے ہرگز اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے خدا نے پیدا کر کے اس دنیا کی رونق اور چہل پہل کو دیکھنے کیلئے یہاں لایا ہے۔ ویسے تو میں ہرگز اس قابل نہیں تھا۔

نہ تھا میں مقصد اعجاز مے کا بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

شاؔد عظیم آبادی کہتے ہیں کہ مجھے شراب کی کیفیت کا بالکل کوئی علم نہ تھا۔ میں اس بات پر یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ شراب پینے سے ایک قسم کا خمار پیدا ہوتا ہے۔ یہ شراب کیا چیز ہے میں اس بات سے بالکل بے خبر تھا۔ بڑی منتیں کر کے مجھے اس کا قائل بنایا گیا اور مجھے زبردستی شراب پینے کیلئے مجبور کیا گیا۔

کجا میں اور کجا یہ شاؔد دنیا کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

غزل کے اس مقطعے میں شاعر عظیم آبادی اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ہی اے شاؔد! کہاں تو اور کہا تیری یہ دنیا۔ میں اس دنیا کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ اصل میں اس دنیا کے انداز اور طریقے نرالے اور عجیب ہیں۔ میں تو ایک ہی جگہ پر تھا اور وہاں سے اٹھا کر مجھے اس دنیا میں لایا گیا۔

کتابی سوالات کے جوابات:

جواب۲: اعجاز مے بمعنی معجزاتِ شراب

دل مضطر بمعنی بے قرار دل

رونق بزم بمعنی مجلس کی روشنی

مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

نام مرزا اسداللہ خان المعروف بہ مرزا نوشہ۔ نجم الدولہ اور دبیر الملک خطابات تھے۔ تخلص پہلے اسد کرتے تھے پھر غالبؔ اختیار کیا۔ مرزا غالبؔ ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا عبداللہ خان تھا۔ جب مرزا غالبؔ کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت مرزا کی عمر پانچ سال تھی۔ ان کا ایک بھائی بھی تھا جس نے جوانی کے دنوں میں دیوانگی کی حالت میں وفات پائی۔ غالبؔ نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا نصر اللہ بیگ کے یہاں پرورش پائی۔ غالبؔ جوانی کے آغاز میں شہر کے خوبصورت اور دلفریب جوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی یہ حسن ان کے چہرے سے نمایا تھا۔ ان کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ بچپن کا زمانہ آگرہ میں گزرا اور شادی ہونے کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ غالبؔ کے یاں سات بچے پیدا ہوئے تھے مگر کوئی بھی زندہ نہ رہا۔ آخری عمر میں صحت خراب تھی اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔

مرزا غالبؔ اردو ادب کی ان ہستیوں میں سے ہیں جنہیں نظم و نثر دونوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل ہے۔ غالبؔ کا کلام اردو شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے۔ غالبؔ کے اشعار زندگی کے سچے ترجمان ہیں۔ عام بول چال کے الفاظ کو جس خوبصورتی سے اشعار کا لباس پہنایا ہے وہ کوئی اور شاعر نہ کر سکا۔ غالبؔ ہر شعر میں نئی بات بیان کرتے ہے۔

غزلیات مرزا غالبؔ

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ابن مریم سے مراد حضرت عیسیٰؑ یا مسیحا ہے جن کو اللہ نے مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے نوازا تھا۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ کوئی مسیحاؑ ہے تو ہوا کرے۔ میں تو جب جانوں جب میری کوئی دوا کرے یعنی میرے دل کو درد عشق سے نجات دلائے۔ حقیقتاً درد عشق کا مداوا مسیحاؑ بھی نہیں کرسکتا۔ اس درد کا مداوا محبوب کی نظر عنایب کے سوا کچھ نہیں۔ بقول سُدرشن فاکر

عشق کا زہر پی لیا فاکرؔ اب مسیحاؑ بھی کیا دوا دیگا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

''کوئی'' سے مراد محبوب ہے۔ غالبؔ فرماتے ہس دیوانگی میں کیا کیا راز کی باتیں بکے جاتا ہوں خدا کرے کہ وہ ان کا مطلب کچھ نہ سمجھے۔ ورنہ راز فاش ہوجانے اور رسوا ہونے کی خدا جانے کیا سزا دیگا۔ جنون میں مجنون خود سے اور گردونواح سے بے خبر ہوتا ہے بقول شاعر

کیا کیا ہوا ہنگامے جنوں یہ نہیں معلوم کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

نہ سبو گر برا کہتے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

دونوں اشعار اخلاقی اور بالکل صاف ہیں۔ اسلئے تشریح خود کیجئے۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　　کس کی حاجت روا کرے کوئی

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کی حاجت پوری نہ کر سکے تو شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بھی ہماری طرح اس چیز کی حاجت رکھتا ہوگا۔ بڑے بڑے بادشاہ امیر بیسیوں باتوں کے حاجت مند ہوتے ہیں۔غریبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

اس شعر میں تلمیح ہے۔خضر سکندر کو آبِ حیات کے چشمے پر لے گئے تھے۔مگر خود آب حیات پی لیا اور سکندر کو وہ ان آدمیوں کے سامنے لے گئے جنہوں نے یہ پانی تو پی لیا مگر بوجہ طولِ عمر ضعیف ونحیف ہو کر گوشت کے لوتھڑے رہ گئے تھے۔سکندر نے یہ عالم دیکھ کر پانی نہ پیا اور محروم رہ گیا۔ گویا خضر کی رہنمائی سے اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ جب خضر کی رہنمائی بھروسے کے قابل ثابت نہیں ہوئی تو اب کس کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جائے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غزل کے مقطعے میں غالب کہتے ہیں کہ گلہ امید ہی پر ہوا کرتا ہے۔ جب امید ہی نہ رہے اور مایوسی کا عالم ہو تو گلا کیسا۔اس حالت میں شکوہ شکائتیں باعث نفرت ودشمنی بن سکتی ہے۔

غزل نمبر۲:

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

یعنی نہ کوئی آرزو پوری ہوتی ہے اور نہ ہی آرزو پوری ہونے کی صورت نظر آتی ہے۔کریں تو کیا کریں۔غالبؔ کہتے ہیں کہ ساری عمر امیدیں پوری ہونے کی امید میں ہی گزر گئی اور جان کندنی

تک اسی امید میں رہیں گے کہ شاید امید بر آئے۔ بقول خود (غالبؔ)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غالبؔ کہتے ہیں موت اپنے مقررہ وقت پر ضرور آئے گی۔ پھر ہم اس کے آنے کا انتظار کیوں کریں۔ موت کا ایک دن تو مقرر ہے۔ خوف و وحشت سے اس دن کے تقرر پر اثر نہیں پڑتا۔ پھر موت کے خوف سے رات بھر نیند کیوں نہیں آتی۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

غالبؔ کہتے ہیں کہ ایک دور ایسا بھی تھا کہ مجھے اپنے دل کی حالت پر ہنسی آتی تھی۔ مگر اب وہ حالت دل جس پر کبھی ہم ہنسا کرتے تھے افسردگی میں اس قدر غوطہ لگا رہی ہے کہ اب اپنے حال پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ اب رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یعنی میرا منہ نہ کھلواؤ میں بہت سی راز کی باتیں جانتا ہوں۔ انہیں کہہ دوں تو تمہاری رسوائی ہوگی اسی مصلحت سے خاموش ہوں۔ ورنہ کیا بات کرنی مجھے نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلا مرنا مجازی معنی رکھتا ہے اور دوسرا حقیقی۔ مجازی معنی سے کثرتِ شوق مراد ہے اور دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ مرتے ہیں مگر مر نہیں چکتے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ دل میں آرزوے موت اس قدر گہری ہو چکی ہے گویا موت کی شدت محسوس ہو جاتی ہیں۔ مگر حقیقت میں نہیں مرتا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالبؔ کہتے ہیں کہ ساری عمر گنہگاری اور شراب خوری میں گزری۔ اب کیا منہ لیکر کعبے جاؤ گے۔ شاید تم کو شرم نہیں آتی۔ دوسرا نکتہ اس میں یہ بھی ہے کہ مرزا غالبؔ شراب کے عادی تھے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، کونسا منہ لے کر کعبے جاؤ گے، شرم کرو۔

نظیر اکبرآبادی کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

نظر اکبرآبادی کا اصل نام ولی محمد اور تخلص نظیرؔ تھا۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہیں۔ غالباً ۱۷۴۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد کاظم اور ملا ولی سے حاصل کی۔ طبیعت میں رنگین مراجی اور آزاد روی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت دہلی چھوڑ کر آگرہ آ گئے اور پھر مستقل طور پر یہیں کے ہو رہے۔ نظیر کو شطرنج بازی، پتنگ بازی، اور اس طرح کے دوسرے مشاغل سے بڑی دلچسپی تھی۔ روزگار کیلئے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔

شاعری میں اپنے زمانے کی عام روش سے ہٹ کر مختلف چیزوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظموں میں ''آدمی نامہ'' مکافات'' ''روٹی نامہ'' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں عوام کی زبان استعمال کی ہے اور عوامی موضوعات پر اظہار خیال کر کے عوامی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ آپ نے ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔

''مفلسی'' از نظیر اکبر آبادی

بند(۱):

یہ بند نظیر اکبر آبادی کی نظم ''مفلسی'' سے لیا گیا ہے۔ اس بند میں نظیر مفلسی کی اور تلخی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب آدمی مفلسی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی حیاتی ایک شدید عذاب بنکر رہ جاتی ہے۔ مفلسی یعنی غریبی اس کو ہر لمحہ ستاتی ہے۔ مفلسی کی وجہ سے وہ دن رات بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ مفلسی کس قدر تلخ ہوتی ہے یہ وہ ہی شخص جانتا ہے جو مفلسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بقول ولی دکنی

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

بند۲:

اس بند میں نظیر کہتے ہیں کہ ایک مفلس انسان کے ذہن میں شان وشوکت کا تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے روٹی کا ایک ٹکڑا ہی معنی رکھتا ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے وہ اپنی جان دے سکتا ہے وہ روٹی کو حاصل کرنے کیلئے ہی دوڑ دھوپ اور جدو جہد کرتا رہتا ہے۔ جس طرح کتے ہڈی کو حاصل کرنے کیلئے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور اسی ہڈی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اسی طرح مفلسی میں انسان ایک دوسرے کے ساتھ روٹی کیلئے لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ غرض مفلسی انسان کی زندگی کو ابتر بناتی ہے۔

بند ۳:

اس بند میں نظیر کہتے ہیں کہ کسی آدمی کی زندگی جب مفلسی میں اسیر ہو جاتی ہے تو اس کی قدر لوگوں میں ابتر ہو جاتی ہے۔ کوئی اسے گدھا کہتا ہے تو کوئی بیل سمجھتا ہے۔ مفلسی کی وجہ سے آدمی کی حالت خستہ ہو جاتی ہے۔ پھٹے کپڑے، گندے اور لمبے بال، منہ خشک، پیلے دانت اور اس کے بدن پر میل جم جاتا ہے۔ غرض مفلسی کی وجہ سے مفلس انسان کا خدوخال قیدیوں جیسا بعض اوقات ان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

بند ۴:

اس بند میں نظیر کہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ بادشاہ ہو یا گدا (بھکاری) مفلسی کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ خدا کسی بھی انسان کو مفلسی کی قید کا قیدی نہ بنائے۔ مفلسی چشم زدن میں صاحب عزت لوگوں کو فقیر بناتی ہیں۔ یعنی مفلسی کی وجہ سے مفلس میں متعدد خرابیاں اور خامیاں پیدا ہوتی ہیں جن کو بیان کرنے میں شاعر نظیر اکبر آبادی خود کو قاصر سمجھتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ مفلسی کی تلخیاں وہ ہی جانتا ہے جس کے دل کو مفلسی جلاتی ہے یعنی مفلس انسان۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب (۱) مفلسی سے انسان کی زندگی تلخیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ مفلس کی حیاتی ایک شدید عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ مفلسی کی وجہ سے وہ دن رات بھوکا اور پیاسا رہ جاتا ہے۔ اس کا حال پریشان اور کپڑے پھٹے ہوتے ہیں اور بدن پر میل جم جاتا ہے۔ لوگ مفلس کی بے عزتی کرتے ہیں۔ مفلسی شریفوں کو بھی ذلیل کرتی ہے۔

جواب(۲) مفلس کو ہر وقت فکرِ خوراک لاحق ہوتی ہے۔کس طرح اس کی پیاس اور بھوک کی تلفی ہو جائے اسی فکر میں رہتا ہے۔مفلس کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا ہی معنی رکھتا ہے جس کے حصول کیلئے وہ دوڑ دھوپ اور جدو جہد کرتا رہتا ہے۔

جواب(۳) حصولِ تشریح کیلئے بند سوم پر غور و خوذ کیجئے۔

محاورات

دل جلانا بمعنی سخت رنج دینا

جملہ: ہجر کے پردے کے زد میں بیٹھ کر میرا دل جلاتے ہو یا وہ مجھ سے ناراض رہ کر میرا دل جلانا سیکھ گیا۔

چھاتی پر مونگ ڈلنا بمعنی سزا دینا یا عذاب دینا

جملہ: وہ ترک تعلق کر کے چھاتی پر مونگ دلگیا۔

جان پر کھیلنا بمعنی ایسا کام کرنا جس میں جان جانے کا خطرہ ہو

جملہ: احمد نے اپنی جان پر کھیل کر حمید کو حادثے سے بچالیا۔

نظر لگنا بمعنی بری نظر کا اثر ہو جانا

جملہ:

یہ کس کی بری تم کو نظر لگ گئی ہے
بہاروں کے موسم میں مرجھا رہے ہو

رباعی کی تعریف

رباعی ربعہ سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔صنفِ رباعی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے۔اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔تیسرا مصرعہ بھی اسی قافئے میں ہوتو کوئی ہرج نہیں۔رباعی کے پہلے شعر کو مطلع نہیں کہتے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم قافیہ ہونے کی بناء پر رباعی کے پہلے دو مصرعے ''مصرّع'' ہوتے ہیں۔رباعی میں عام طور پر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس کا تیسرا مصرعہ سب سے زیادہ پرزور ہو۔قافیوں کی پابندی اور بحر کی پابندی ایسی شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا رباعی کیلئے لازمی ہے۔

رباعی کب وجود میں آئی یا سب سے پہلے رباعی کس نے لکھی؟ ان سوالات کے جوابات دستیاب نہیں ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ رباعی کی ایجاد کا سہرا قدیم ایرانی شاعر رودؔکی (وفات ۹۴۰ء) کے سر ہے۔لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔رباعی میں عام طور پر حکیمانہ اور عاشقانہ مضامین ادا کئے جاتے ہیں۔چنانچہ رباعی میں اور طرح کے مضامین بھی نظم کئے گئے ہیں۔

رباعیات "میر ببر علی انیسؔ"

رباعی (۱):

یہ رباعی میر ببر علی انیسؔ کی قلمبند کی ہوئی ہے۔اس رباعی میں انیسؔ کہتے ہیں جس شخص کو خدا تعالیٰ اس دنیا میں عزت سے نوازتا ہے اس پر لازمی ہے کہ وہ اپنے دل میں عاجزی پیدا کریں۔ اس کی فطرت میں شیرینی پیدا ہوتی ہے۔وہ فیاض خصلت کا مالک بن جاتا ہے۔اس کے برعکس وہ

اشخاص جو بے دماغ ہوتے ہیں ان کے دہان سے مدحِ خود کے جملات نکلتے ہیں۔یعنی وہ خود اپنے منہ میاں مٹھوں بنتے ہیں۔ایسے اشخاص کو میر انیسؔ نے خالی برتنوں سے مشابہہ کیا ہے۔جیسے خالی برتن ہمیشہ صدا دیتے ہیں ان کے دہان پر بھی کلمات مدح ہوتے ہیں۔

رباعی(۲):

یہ رباعی میر ببر علی انیسؔ کی قلمبند کی ہوئی ہے۔اس رباعی میں انیسؔ کہتے ہیں کہ بے شک والدین نے شفقت اور اخلاص کی حدوں کو پار کیا ہیں۔درحقیقت خالقِ کائنات اپنی مخلوق سے اس قدر محبت کرتا ہے جس کے مقابلہ میں اخلاص والدین ایک ذرہ برابر بھی نہیں۔غاضب اور رحیم اللہ تعلیٰ کے اسماء صفات ہیں۔مگر خالقِ کائنات نے دستِ رحمت اپنے غضب سے زیادہ پھیلائیں ہیں۔اس نے فرمان بردار بندوں کے لئے جنت انعام کے طور پر بنایا ہے۔اور جہنم نافرمان بندوں کیلئے۔غرض خالق نے اپنے آپ پر عدل واجب کیا ہے۔

رباعی(۳):

اس رباعی میں میر انیس کہتے ہیں کہ جب انسان دنیا فانی کو چ کر گے کا یعنی جب زیست بے وفائی کرے گی اور جب اس کو سپرد خاک کیا جائے گا تو وہاں یعنی قبر میں اس کو تنہا ہی رہنا ہوگا۔ وہاں خاک کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔نہ تکیہ اور نہ بچھونا ہوگا۔اس گوشۂ تنہائی میں نہ کوئی ہمدم اور نہ کوئی دوست ہوگا۔وہاں صرف تنہائی،تاریکی اور وحشت ہوگی۔

کتابی سوالات کے جوابات:

جواب ا) دنیا میں جن اشخاص کو خدا تعالیٰ عزت اور نعمتوں سے نوازتا ہیں وہ بزمی اور تواضع اختیار کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں شیرینی پیدا ہوتی ہے وہ فیاض خصلت کے مالک بن جاتے ہیں۔

رباعیات جگ موہن لال رواںؔ

رباعی ا:

یہ رباعی جگ موہن لال رواںؔ کی قلمبند کی ہوئی ہے۔اس رباعی میں رواں کہتے ہیں کہ دنیا کی رنگینی انسان کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ دنیا کی طرح یہ خوشیاں بھی عارضی ہیں۔ جو کچھ عرصہ تک ساتھ دیکر جدا ہو جاتی ہیں۔شاعر کے خیال میں وصعت پیدا ہوگئی ہے اور اس کو فنا ہونے کی فکر سے ہر ایک سامان عیش میں کلفت یعنی رنج نظر آنے لگا ہے۔

رباعی ۲:

اس رباعی میں رواںؔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے یعنی ختم ہونے والی ہے۔ یہاں کی ہر شے کو ایک دن تباہ ہونا ہیں۔لیکن انسان لالچ اور خواہشات میں اس قدر ڈوب گیا ہے کہ اس کو دنیا بے ثبات نظر آنے لگی ہے اور وہ ترقی اور کامیابی کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے۔رواںؔ کہتے ہیں کہ لوگ مرکر بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ متوفی کی قبر پر سنگ مزار رکھا جاتا ہے تاکہ اس کا نام موجود رہیں۔ انسان کو مرکر بھی زندگی کی امید رہتی ہے۔

رباعی ۳:

اس رباعی میں رواںؔ کہتے ہیں کہ میں کیا بتاؤں یہ زندگی کیا ہے۔زندگی فنہ ہونے والی شے ہے۔ ہر ایک شخص کی زندگی تین مرحلوں سے گزرتی ہوئی آخر میں ختم ہو جاتی ہے۔اور تیسرا مرحلہ

پیری ہے جو ایک بار آئے تو مرگ تک جانے کا نام ہی نہیں لیتی ۔اسی طرح زندگی ان مرحلوں سے گزرتی ہوئی فنا ہو جاتی ہے اور اس کو روک کر رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

کتابی سوالات:

جواب(۱) جواب کیلئے پہلی رباعی کا طالعہ کیجئے

جواب(۲) تیسری رباعی میں

بچپن کو پھولوں کی مہک سے

جوانی کو تیز ہوا سے اور

زندگی کا موجِ فضا سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

خاکہ نگاری

خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں کسی شخص کی خصوصیات یا خامیاں پیش کی جاتی ہیں۔ایک خاکہ نگار کو کسی شخص کے حالات اور واقعات اس طرح پیش کرنے چاہئے کہ پڑھنے والا اس شخص کی عظمت سے واقف ہو۔خاکہ نگاری میں کسی کی شخصیت کی تصویر بالکل مختصر طریقے سے پیس کی جاتی ہے۔خاکہ نگاری سوانح حیات سے مختلف اور الگ ہے۔اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب کے ساتھ لکھے نہیں جاتے ہیں۔ایک خاکے میں ایک شخصیت کی خوبیاں جس طرح بیان کی جاتی ہیں اسی طرح اس کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔خاکہ نگار کو کسی بھی ذاتی عناد یا دشمنی کا پہلو مدنظر نہیں رکھنا چاہئے۔دراصل جدید خاکہ نگاری مختصر افسانے سے ملتا جلتا ہے۔خاکہ بھی ادب کی مقبول ترین صنف میں شامل ہے۔

خاکۂ حالی

کتابی سوالات کے جوابات:

جواب ۱) مولانا خالی ایک سچے وطن پرست اور قومی اتحاد کے علمبردار تھے۔آپ ہندو مسلمان اور سکھ کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔آپ میں تعصب اور تنگ نظری کا نام و نشان نہ تھا۔آپ ہندو مسلمان سکھ اتحاد کے زبردست حامی تھے۔آپ کو بہت ہی پریشانی ہوتی تھی جب آپ کسی فرقہ دارانہ فساد کا واقعہ سنتے تھے۔وطن کی محبت آپ کا خاص موضوع رہا ہے۔وطن کی مٹی کو کافی عزیز سمجھتے تھے۔آپ ہمیشہ اور ہر وقت ایک سچے وطن پرست اور قومی اتحاد کے علمبردار رہے ہے۔

جواب ۲) مولانا حالی نے علمی میدان میں اپنی بساط کے موافق دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو اپنے وطن میں یعنی پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو حالی ہائے سکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک اورینٹل لائبریری قائم کی۔

(۴)

سوانح نگاری (حیات) میں پوری زندگی اور اس کی تفصیلات کا بیان ہوتا ہے۔خاکے میں ذاتی تاثرات بیان کئے جاتے ہیں اور شخصیت نگاری میں ذاتی تاثرات بیان کئے جاتے ہیں اور شخصیت نگاری میں ذاتی تاثرات اور دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات درج کی جاتی ہے۔یعنی بطورِ شخص ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں اس کے بیان کو شخصیت نگاری کہتے ہیں۔

(۵)

بیان ۱:

مولانا حالؔی شہرت اور خودنمائی پسند نہیں کرتے تھے۔

ثبوت:

مولانا حالؔی سے لوگ اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر پیش کرتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے، اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔

بیان ۲:

مولانا حالؔی زبردست مہمان نواز تھے۔

ثبوت:

مولانا حالؔی مہمانوں کے آنے پر دلی مسرت حاصل کرتے تھے اور دل و جان سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشیر مولوی انوار احمد ایک بار مولانا حالؔی سے ملنے پانی پت آئے۔ حالؔی نے ان کی مزاج پُرسی کے بعد کھانا کھلا کر بستر پر لٹا دیا۔ رات کے ایک بجے وہ اٹھ کر کمبل ہاتھوں میں لیکر ان کے بستر پر ڈال دی تا کہ سردی اور ٹھنڈ نہ لگے۔

بیان ۳:

مولانا حالؔی بعض اوقات چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

ثبوت:

طالب علمی کے زمانے میں مولوی عبدالحق اور مولانا حمید الدین مولانا حالؔی سے ملنے علی گڑھ گئے۔ مولانا حالؔی ان دونوں کی عزت اور تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔

انشائیہ کی تعریف

انشائیہ کو انگریزی میں Essay کہتے ہیں۔ انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی سے آئی ہے۔ انشائیہ نگار بے تکلف اور غیر علمی انداز سے اپنی بات کہتا ہے۔ وہ اپنے دل کی باتیں اس میں بیان کرتے ہے۔ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر ہی اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ انشائیہ مختصر ہوتا ہے۔ انشائیہ کیلئے تخیل یعنی خیال کا بلند ہونا لازمی ہے۔ انشائیہ کی اہم خصوصیت اختصار ہے۔ اس میں خیالات غیر منظّم طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ انشائیہ کسی ایک موضوع پر تحریر کیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ اس کیلئے لازمی نہیں ہے۔ اردو میں سرسید، محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی نے اعلیٰ معیار کے انشائیے لکھے ہیں۔

"خوشامد" از سرسید احمد خان

کتابی سوالات کے جوابات:

جواب (ا) خوشامد کو بدترین چیز اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ خوشامدی سے انسان ذہنی اور روحانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ خوشامد ایک تباہ کرنے والی بیماری کا نام ہے۔ اس سے ہماری عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ خوشامد سے سچ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔ دھوکہ اور جھوٹ ہماری طبیعت پر غالب ہو جاتا ہے۔ جس کی خوشامد کی جائے یا جو خوشامدی کرتا ہے دونوں بے وقوف اور نالائق سمجھے جاتے ہیں اور دونوں جھوٹی تعریف کے عادی ہو جاتے ہیں۔

جواب۲) خوشامدی خطرناک بیماری کا دوسرا نام ہے۔خوشامدی ہمیشہ دھوکہ دہی کا عادی ہوتا ہے۔اور دھوکہ دیکر اپنا کام نکالتا ہے۔ایک خوشامدی میں جو خوبیاں موجود ہوتی ہیں وہ سب ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ جھوٹی تعریف کرنے اور سننے کا عادی ہو جاتا ہے۔ خوشامدی ہمیشہ سُست اور کمزور رہتا ہے۔اور اس کی یاداشت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔خوشامدی نہایت خودسر اور مغرور ہوتا ہے۔ وہ روحانی اور ذہنی طور پر نہایت کمزور ہوتا ہے۔

جواب۳) ''خوشامد'' سرسید احمد کان کا لکھا ہوا انشائیہ ہے۔ بقول سرسید احمد خان خوشامد ایک مہلک بیماری ہے۔انسان کے دل کی بیماریوں میں سے خوشامد بھی ایک بیماری ہے۔ اس کا اثر ایک انسان کے دل پر گہرا پڑتا ہے۔ پہلے ہم اپنی خوشامد خود ہی کرتے ہیں ۔پھر اس کی نوبت دوسروں تک آتی ہے۔خوشامدیوں کے فریب سے عقل اندھی ہوتی ہے۔خوشامد کرنے سے ایک انسان حق ،صداقت اور سچائی سے دور رہتا ہے۔ اور تمام تر خوبیوں سے محروم رہتا ہے۔خوشامد سے ایک انسان کی ذہانت اور قابلیت ختم ہو جاتی ہے۔خوشامد بدترین چیز ہے جو دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔خوشامد سے اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔

سرسید احمد خان کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

سرسید احمد خان ۱۷۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے بزرگوں کو شاہی دربار میں رسائی حاصل تھی۔ان کی پرورش اور تربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جب ملازمت کا وقت آیا تو سرسید احمد خان نے درباری تعلق پر انگریزی سرکار کی ملازمت کو ترجیح دی اور سررشتہ داری سے شروعات کر کے صدر امین کے عہدے تک پہنچے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد وہ بسلسلۂ ملازمت بجنور میں مقیم تھے۔سارا ہنگامہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس میں انگریزوں کی حمایت کی۔ پھر انہوں نے ایک رسالہ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے تین پرچے نکالے۔اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مسلمان انگریزی سرکار کے بدخواہ نہیں ہیں۔

جب ان کا تبادلہ صدر امین کی احیثیت مراد آباد کو ہوگیا تو یہاں انہوں نے بے گناہ مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ یہاں انہوں نے ایک شفاخانہ اور ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا اور ہندو مسلمانوں کی یکساں مدد کی۔اس کے بعد غازی پور میں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کیلئے جدید تعلیم کا بندوبست کیا۔علی گڑھ میں محمڈن کالج قائم کیا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موجود ہے۔ان کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔مسلمانوں کے اس محسن اور مرد مجاہد نے ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔

اردو ادب پر سرسید کا بڑا احسان ہے۔انہوں نے اردو نثر میں مدعا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اپنی بات کو دلیل کے ساتھ واضح الفاظ میں کہنا سکھایا۔اردو کو لفاظی اور بے ضا عبارت

آرائی سے نجات دلائی۔آج جو زبان، ہم لکھتے اور بولتے ہیں اس کی داغ بیل سرسید نے ڈالی تھی۔ نثر کی طرف انہوں نے خود توجہ کی لیکن وہ شاعر نہ تھے۔انہوں نے شعر کہے ضرور لیکن جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ ان کا میدان نہیں اسلئے اس کوچے سے جلد نکل آئے۔مختصر یہ کہ اردو نثر اور نظم دونوں سرسید کے احسان سے گراں بار ہیں۔

افسانہ "آسمان، پھول اور لہو" از نور شاہ

کتابی سوالات کے جوابات

جواب ۱:

دوکاندار لڑکے کو گڑیا اسلئے نہیں بیچتا تھا کیونکہ اس کے پاس موزوں خردہ (یعنی مناسب رقم) گڑیا کو خریدنے کیلئے نہیں تھی۔دوکاندار کے لئے ناممکن تھا کہ وہ لڑکے کو اس تھوڑی سی رقم کے عوض گڑیا بیچتا

جواب ۲:

لڑکے کے مطابق اس کی بہن کو وہ گڑیا بہت پسند آئے گی اور اسے پا کر خوش ہوگی۔چونکہ اس کی بہن دنیا فانی سے رحلت کر چکی تھی۔اور اس کی والدہ جان کندنی کی کشمکش میں الجھی تھی۔ معصومیت کے باعث لڑکے کو گمان تھا کہ وہ مطلوب شدہ گڑیا اپنی والدہ کے ہوتھوں اپنی بہن کو بھجواتا۔

جواب ۳:

چونکہ لڑکے کی بہن اس دنیا سے کوچ کر چکی تھی۔اور اس کی والدہ جان کندنی کی کشمکش میں الجھی تھی۔اس کے والد نے اسے کہا تھا کہ اس کی امی بھی آسمانوں میں اس کی بہن کے پاس جانے والی ہے۔اسلئے وہ اپنی والدہ کے ہاتھوں وہ مطلوب شدہ گڑیا اپنی دیدی کو بھیجنے والا تھا۔

جواب۴:

افسانہ ''آسمان پھول اور لہو'' میں موجود ''آنٹی'' کے کردار پر چند درج ذیل ہیں۔

الف) آنٹی کے قدم دوکان کے سامنے تھم گئے اور وہ بچے کا مشاہدہ کرنے لگی۔ یہ عمل اس کے جذباتِ خلوصِ اطفال کی عکاسی کرتا ہے۔

ب) آنٹی نے لڑکے کو اس کی مطلوب شدہ اشیاء دلوادئے۔ یہ عمل اس کے فیاض، ہمدرد اور مددگار ہونے کا بین ثبوت ہے۔

ج) وہ لڑکے کو خدا سے نا امید نہ ہونے کی اور اس پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کر کے اپنی خدا پرست اور خداشناس ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

د) بقول نوشاہ (آنٹی) جب جب لوگوں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکتی ہے تو خلوص کے پھول جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ یہ نورشاہ کا امن و آستی پسند ہونے کا اور دور اندیشی کا بین ثبوت ہے۔

ہ) نورشاہ تصوراً اس معصوم سے لڑکے کو آسمانوں کی جانب بھاگتے ہوئے جانا دیکھتی ہے۔ جو اس کے قوتِ متخیّلہ (تخیّل) کی پرواز کا پتہ دیتی ہے۔

جواب۵:

لڑکے نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ اسے اتنی رقم ملے جس سے وہ اپنی والدہ کے لئے پھول برنگ سفید اور اپنی بہن کیلئے گڑیا خرید سکے۔ اس کی یہ دعا بوساطت مصنف نورشاہ (آنٹی) قبول ہوگئی۔

جواب۶:

لڑکے کی والدہ (ماں) کا نام ''حلیمہ بی بی'' اور بہن کا نام ''خالدہ'' تھا۔

جواب ۷:

افسانہ ''آسمان پھول اور لہو'' عصری کرب اور حادثات وسانحات کی عکاسی کرتا ہے۔اس افسانے کے مشاہدے سے اس کا مرکزی لبِ لبات (ماحصل) یہ عیاں ہوتا ہے کہ اطفال بمشابۂ نود میدہ پھول عصری حادثات کے شکار ہو کر لہولہان ہو جاتے ہیں اور اس عارضی مسکن سے کوچ کر کے آسمانوں میں چلے جاتے ہیں۔گو بسبب اس افسانہ کا نام ''آسمان پھول اور لہو'' رکھا گیا۔

فانی بدایونی کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

نام شوکت علی خان۔ پہلے شوکت اور بعد میں فانؔی تخلص رکھا۔۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ کو بدایون میں پیدا ہوئے۔ابتعائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی اے کیا اور پھر ملازمت کی۔کچھ عرصہ تک استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن گئے۔قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے وکالت کرتے رہے۔لیکن آپ کا دل وکالت میں نہیں لگا اور اس پیشے میں کامیاب نہ ہوئے۔ زندگی کے آخری دن پریشانی اور غربت میں گزرے۔۱۹۴۱ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

فانؔی کا شمار اردو کے ممتاز غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔آپ کی شاعری اعلیٰ درجہ کی تھی۔آپ کے اشعاروں میں احساس کی شدت، خیال کی گہرائی اور درد کی شدت پائی جاتی ہے۔آپ کا موضوع غمِ حیات ہے۔دکھوں کی بنا پر فانی کو نا امیدی یعنی یاسیات کا رہنما کہا جاتا ہے۔

غزل فانی بدایونی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

غزل کے اس مطلع میں فانی بدایونی کہتے ہیں میں یہ نہیں جانتا کہ دنیا کیا ہے۔ اس کی اصلیت مجھے معلوم نہیں کہ دنیا سستی ہے یا مہنگی۔ شاعر دنیا کی قیمت نہیں جانتا۔ اس کی نظروں میں زندگی ایک ناپائیدار شے ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ شاعر موت سے خوف زدہ ہے۔ شاعر موت سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ اسے مفت بھی اگر ملے تو وہ لینے کیلئے تیار نہیں۔ غرض شاعر کی نظر میں زندگی کی کوئی قیمت نہیں اور وہ موت سے بھی خوف زدہ ہے۔

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہے جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

فانی کہتے ہیں کہ میں نے آبادیوں کو بستے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ان کو ویران ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آبادیاں تباہ ہونے کے بعد پھر آباد ہوتی ہے۔ یعنی ویرانے بھی آباد ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ لیکن دل جو ایک بار اجڑ رجائے تو پھر کبھی بسنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔ دل کی بستی ایک عجیب سی بستی ہے جو ایک رار اجڑ جائے تو پھر بسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

فانی کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کی ایک نظر کے بدلے میں اپنی جان کی بازی لگانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جان اپنے محبوب کی ایک نظر کے بدلے میں بیچنا چاہتا ہوں۔ اب خریدار یعنی معشوق کی مرضی ہے کہ کیا وہ میری جان اتنے سستے داموں میں خریدنے کیلئے تیار ہے کہ نہیں۔

جگ سوتا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

فانؔی محبوب سے کہتے ہیں کہ تیرے بغیر میری دنیا ویران ہے۔ تیرے بغیر میرا دل ویران ہے۔ دراصل دنیا اس وقت بھی بستی تھی اور اب بھی بسی ہوئی ہے۔ لیکن محبوب کی جدائی کی وجہ سے میری زندگی ویران ہوگئی۔ دنیا کی رونق اور چہل پہل میں میرے غمزدہ دل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ اسے اس بات کی فکر نہیں کہ کوئی غمزدہ ہے یا کوئی خوش ہے۔

آنسوں تھے جو خشک ہوئے ہے کہ اُمڈا آتا ہے دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

فانؔی کہتے ہے کہ محبوب کی یاد میں اب میری آنکھوں کے آنسوں بھی خشک ہوگئے ہیں۔ ان آنکھوں میں اب آنسوں بھی نہیں آتے ہیں اور دل کا یہ حال ہے کہ وہ لبریز ہوا ہے۔ میرے دل پر ایک ایسی گھٹا یعنی بادل چھائے ہوئے ہیں جو نہ صاف ہونے کا نام لیتے ہیں اور نہ ہی برستے ہیں۔ ان بادلوں نے میرے دل کو بری طرح سے گھیر لیا ہے۔

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانؔی کہتے ہیں کہ دل آسانی سے اجڑ جاتے ہیں لیکن مشکل سے پھر بستے ہیں۔ اجڑی ہوئی بستی کو پھر سے بس جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ یعنی جب ایک بار بستی تباہ ہوجاتی ہے تو اس کے بسنے میں کافی وقت اور دیر لگ جاتی ہے۔

فانؔی! جس میں آنسوں کیا دل کا لہو کا کال نہ تھا ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

غزل کے اس مقطعے میں فانؔی اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں اے فانؔی ایک وقت ایسا بھی تھا جب تو اپنے محبوب کی یاد میں خون کے آنسوں بہایا کرتا تھا۔ تمہاری آنکھیں خون کے آنسوں رویا کرتی تھی لیکن افسوس اب وہی آنکھیں خشک ہوگئی ہیں۔ اب ان آنکھوں میں آنسوں

ہی نہیں ہیں اب وہی آنکھیں دو آنسوؤں کے قطروں کیلئے ترستی ہے۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب ۱:

شاعر محبوب کا اس قدر شیدائی ہے کہ اسے اپنے محبوب کی نظر عنایت سے ہی چین ملتا ہے۔ اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ شاعر کی نظر میں سکونِ قلب محبوب کی نظر عنایت سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایک عاشق کے نصیب میں اس کے محبوب کی نظر کرم نہ ہو تو اس کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ محبوب کی نظر عنایت حاصل کرنے کیلئے ایک عاشق اپنی جان تو کیا دین و ایمان بھی کھو بیٹھا ہے۔ لہٰذا شاعر محبوب کی ایک نظر کے بدلے میں اپنی جان جیسی قیمتی شے کو بھی فروخت کرنا چاہتا ہے۔ بقولِ شاعر

حشر بھی تو ہو چکا رخ سے نہیں ہٹتی نقاب
حد بھی آخر کچھ ہے کب تک کوئی دیوانا رہے

جواب ۲:

بے شبہ دل کی بستی ایک نرالی یعنی انوکھی بستی ہے۔ اس لئے کہ دل اگر ایک بار اجڑ جائے تو پھر کبھی بسنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔ آبادیاں اگر ایک بار ویران ہو جاتی ہے تو وہ آباد بھی ہو جاتی ہیں لیکن جب آئینہ دل میں ایک بار خراش آجاتی ہے۔ تو پھر اس کا جڑنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ دل کی بیقراری کبھی بھی قرار میں تبدیل نہیں ہوتی۔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی دل کا ویران آباد نہیں ہوتا۔ بقول غالبؔ

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینا جو آئے زخم کاری ہے